Date of Publication: 23-05-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 May 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 June 2013 — یکم تا ۷ رجون ۲۰۱۳ء
Issue: 21, Vol.: 72 — شمارہ نمبر:۲۱، جلد نمبر: ۷۲

مصحفی اور اُن کا عہد: ایک جائزہ

پہلی قسط

ڈاکٹر الف ناظم (امن گیٹ، ابوبکر نگر، دیوریا 27400، یوپی)

اردو شاعری کی تاریخ میں مصحفی ایک ایسی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں جن کی عظمت و شعریت کا تاریخ ادب میں ذکر تو آتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ عوامل بھی زیر بحث آتے ہیں جن سے ان کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔ ہمارے اکثر تذکرہ نگاروں اور ناقدین نے شعری و فنی مسائل سے قطع نظر مصحفی کی شخصیت، مزاج اور معرکہ آرائیوں پر زیادہ خامہ فرسائی کی ہے۔

مصحفی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں جس کی وجہ سے وہ فوراً پہچان لیے جائیں اور یہ کہ ان کی انفرادیت زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ یہی بات اکثر ان کی شاعری کے بارے میں کہی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو محمد حسین آزاد کی یہ رائے ہے کہ مصحفی کے نظر ثانی کا موقع نہ دیا اور اشعار کا انبار لگا دیا۔ خود مصحفی کو بھی اس کا احساس تھا:

تجھ کو کیا بسیار گوئی سے ہے کام اے غفور
مصحفی موقوف کر اس کثرت اشعار کو

یا

بکواس لگ گئی ہے تجھے کیسی مصحفی
شعر و غزل ہیں اب سے کہے تیرے بے حساب

لیکن اس انبار میں بھی مصحفی کی شاعری کا ایک حصہ ایسا نکلتا ہے جس میں اعلا درجے کی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں، چناں چہ زود گوئی اور بسیار نویسی کے باوجود مصحفی بڑے شاعروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔

مصحفی نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں اپنا دائمی نقش چھوڑا۔ عربی میں بھی شعر کہے۔ فارسی کا ایک دیوان، دیوان نظیری کے جواب میں تیار کیا۔ اس کے یہاں سب رنگ کے شعر ہوتے ہیں، کسی طرز خاص کی خصوصیات نہیں۔ بعد کے تقریباً تمام ناقدین کی تحریروں میں آزاد کے اسی خیال کی بازگشت سنائی دیتی ہے، یعنی مصحفی ایک زبردست قوت آخذہ کے مالک تھے، گویا ان کا اپنا کچھ نہیں ہے، جہاں سے جو کچھ ملتا ہے اٹھا لاتے ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مصحفی کے کلام میں مختلف رنگوں یا طرزوں میں شعر کہنے کی سعی نظر آتی ہے اور تقلید میں مصحفی سے بڑھ کر شاید کوئی دوسرا شاعر نہ ہوا ہوگا۔ لیکن مصحفی کی اس تقلیدی روش کا ذکر کچھ اس طرح کیا جاتا رہا ہے گویا اس روش کو اپنا کر مصحفی نے خسارے کا سودا کر لیا تھا اور اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ اچھی شاعری کے لیے جن رموز و نکات سے واقفیت اور جن صلاحیتوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ مصحفی کے یہاں کس حد تک موجود ہیں۔

مصحفی ایک زود گو شاعر تھے اور زود گوئی نے انھیں قلم روک کر لکھنے اور علاوہ بھی فارسی اشعار کا خاصا سرمایہ یادگار چھوڑا۔ اردو غزلیات کے آٹھ دواوین اور ایک دیوان قصائد بھی ان سے یادگار ہے۔ کئی چھوٹے چھوٹے نثری رسالے بھی ترتیب دیے۔ اس کے علاوہ دو تذکرے شعرائے اردو کے (تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا) اور ایک تذکرہ شعرائے فارسی کا (عقد ثریا) لکھا، یہ تذکرے مصحفی کے شعری ذوق اور تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔

مصحفی کے فکر و فن کا باقاعدہ مطالعہ اس لیے بھی نہ کیا جاسکا کہ ان کا مکمل کلام آسانی سے دستیاب نہ تھا۔ نیاز فتح پوری نے ماہنامہ 'نگار' (۱۹۳۹ء) کے مصحفی نمبر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ مومن سے پہلے وہ مصحفی اور میر پر فریفتہ ہوئے تھے۔ میر پر تو اس لیے قلم نہ اٹھایا کہ ان پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ مصحفی کی طرف توجہ میں اس لیے تاخیر ہوئی کہ ان کا بہت کم کلام حاصل ہوسکا تھا اور اس کے بعد جب حسرت موہانی نے غیر مطبوعہ کلام شائع کیا تو مصحفی کی شاعری کو سمجھنے کا کچھ موقع ملا لیکن چوں کہ اس کا پورا کلام سامنے نہ تھا اور جی چاہتا تھا کہ سب کا سب مطالعے میں آجائے، اس لیے اور بھی تاخیر ہوئی۔ لیکن آٹھوں دیوان مہیا نہ ہوسکے تو انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ مصحفی کا جتنا اور جیسا کلام مل سکتا ہے، اسی پر قناعت کرنا چاہیے۔

لیکن آج مصحفی کے اردو غزلیات کے آٹھوں دواوین، دیوان قصائد اور تینوں تذکرے شائع ہوچکے ہیں، چنانچہ محققین و ناقدین کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی ہے اور بعض اچھے مقالے بھی مصحفی کے فکر و فن پر لکھے گئے، لیکن مصحفی کی غزل کے سوا دوسری اصناف مثلاً مثنوی، قصیدہ وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو اب تک نہیں ہوئی ہے اور مصحفی کی غزل ہی کی طرح ان کی مثنوی نگاری اور قصیدہ گوئی کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مصحفی کی مثنویاں ان کے کلیات غزلیات میں شامل ہیں لیکن دیوان قصائد کو مصحفی نے الگ ترتیب دیا۔ قصائد کی تعداد سے ظاہر ہے کہ وہ ایک مشاق قصیدہ گو تھے۔ غرض کہ میر کے بعد غزل کی روایت کو، سودا کے بعد قصیدے کی روایت کو اور میر حسن کے بعد مثنوی کی روایت کو جس شاعر نے آگے بڑھایا ان میں مصحفی کا نام بہت نمایاں ہے۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اپنی شخصیت کے لحاظ سے مصحفی تنہا نظر آتے ہیں۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پیش رو اور معاصر شعرا کے مختلف لہجوں کو ملانے اور امتزاجی عمل سے ایک نیا طرز اور نئی آواز تخلیق کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ مصحفی کے اس امتزاجی مزاج نے نہ صرف غزل بلکہ قصیدہ اور مثنوی میں اپنی فنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مصحفی کی غزل کا لہجہ مدھم ہے۔ ان کی مثنوی اور قصیدے میں بھی غزل کا یہی فطری لہجہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔

کسی فنکار کی شخصیت اور اس کے ادب کو سمجھنے کے لیے اس کے عہد کی سماجی و تہذیبی زندگی نیز اس عہد کے علمی و ادبی اثرات کا مطالعہ بھی ضروری ہے کہ فنکار کی شخصیت کی تعمیر میں ان حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ دراصل سماج اور تہذیب کا گہرا تعلق ہے اور ادب بغیر سماج و تہذیب کے وجود میں نہیں آتا۔ مصحفی کا عہد سیاسی اعتبار سے نہایت انتشار اور ہنگامہ آرائیوں کا دور ہے۔ اورنگ زیب کے بعد اس کے جانشینوں میں اس کی سی قوت نہ تھی۔ حالاں کہ اورنگ زیب نے اپنی سلطنت کو بیٹوں میں تقسیم کرکے انھیں سلطنت کے لیے آپس میں جھگڑے سے بچایا تھا لیکن اس کی موت کے بعد شہزادے فوراً

اپنی تلواریں نکال کر تخت و تاج کے لیے برسرِ پیکار ہوگئے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شہزادے بُری طرح ناکام رہے۔ مصحفی اور ان کے دیگر معاصرین ان حالات سے بہت متاثر ہوئے اور دہلی میں نادر شاہ اور احمد شاہ کے مسلسل حملوں کے باعث دہلی میں زندگی دشوار ہو جانے پر ہر روز شعرا پورب کے قافلوں میں شامل ہوکر ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ دوسری طرف لکھنؤ نوابوں اور انگریزوں کے بڑھتے تسلط کے سبب روز افزوں تبدیلیوں سے دوچار ہو رہا تھا، البتہ یہاں دہلی کی بہ نسبت کسی قدر فضا پُرسکون تھی۔ نوابین اودھ نے لکھنوی تہذیب کو نکھارا، شعر و ادب کو فروغ دیا، شعرا کی سرپرستی کی اور خود بھی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ ظاہری شان و شوکت میں اس وقت لکھنؤ کا جواب نہ تھا، لیکن اس تہذیب میں فکری روایت کی جڑیں زیادہ استوار نہ ہو سکیں۔ تاہم کچھ مخصوص اوصاف کی بنا پر اس تہذیب کو اعلا مقام حاصل ہو گیا تھا۔ مصحفی کے کلام میں اس تہذیب کے نقوش نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

معاصرین سے مراد کسی عصر میں ایک ساتھ تخلیقی عمل میں مصروف فنکاروں کی جماعت سے ہے۔ مصحفی کے معاصرین کو دو زمروں میں رکھا جا سکتا ہے، ایک وہ جن سے ان کی چشمکیں اور معرکہ آرائیاں رہیں، مثلاً جرأت، انشا وغیرہ۔ دوسرے وہ جن سے مصحفی بے حد متاثر تھے اور ان کی تقلید بھی کی، مثلاً درد، سودا، میر، میر حسن، نظیر وغیرہ۔ آخر الذکر کو ہی مصحفی کے اہم معاصرین میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ دور شعر و ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کی تشکیل کا بھی دور تھا۔ مصحفی اور ان کے معاصرین اپنے کلام میں نئے نئے مقامی اور عوامی الفاظ کو تخلیقی زبان کا حصہ بنا رہے تھے۔ اگرچہ ان کے پیش نظر زبان کا کوئی اعلا معیار نہ تھا اور نہ ہی کوئی باضابطہ قواعد کی کتاب مرتب ہو سکی تھی، لیکن یہ تمام شعرا اردو کے علاوہ فارسی زبان و ادب سے بخوبی واقف تھے۔ فارسی الفاظ و تراکیب کے ساتھ ساتھ دیسی اور عوامی الفاظ کو بھی سلیقے سے استعمال کر رہے تھے، حالاں کہ ان کے پیش رو شعرا بھی ہندی اور روزمرہ الفاظ کو استعمال کر چکے تھے، لیکن مصحفی اور ان کے معاصرین کے یہاں ہندی اور روزمرہ الفاظ بھی استعمال ہو کر فارسی الفاظ و تراکیب سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

عشق، تصوف اور شاعری دونوں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ خواجہ میر درد بنیادی طور پر غزل گو تھے، غزل کے علاوہ انھوں نے مخمس، رباعیاں بھی ہیں۔ درد کے کلام میں تصوف و معرفت کے خیالات کثرت سے نظر آتے ہیں لیکن وہ محض صوفی شاعر نہیں تھے۔ ان کے کلام میں عشق مجازی کا طاقت ور رجحان بھی موجود ہے۔ درد عملی طور پر بھلے ہی ایک زبردست صوفی تھے لیکن شاعری میں انھوں نے اپنے عہد کی شعری روایت کا پورا خیال رکھا۔ سودا نے قصیدے کو صنف کی حیثیت سے انتہائی بلندی پر پہنچا دیا۔ ان کی غزل بھی اس عہد کی شعری روایت کا ایک اہم حصہ ہے جس میں تھوڑے سے انحراف کے ساتھ خارجی عناصر کی جھلک ملتی ہے۔ سودا نے ایسا کر کے دراصل ایک نئی روایت کا آغاز کیا جس کی توسیع مصحفی اور ان کے بعد کی نسل کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ سودا کے کلام میں عموماً عشق کا ماورائی تصور نظر نہیں آتا۔

میر اس عہد کی سب سے قد آور ادبی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ غزل ان کے مزاج کو سب سے زیادہ راس آگئی تھی۔ ان کے بعد کئی نسلوں نے میر ہی کی غزل کو اپنا معیار بنایا۔ مصحفی کی طرح میر بھی زود گو شاعر تھے لیکن زود گوئی سے انھیں کچھ نقصان نہ پہنچا کہ ان کا ہر شعر کسی نہ کسی خصوصیت کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔ میر کی غزل میں عشق کا بہت وسیع تصور ملتا ہے۔ میر نے اس میں اتنے تجربے شامل کر دیے ہیں کہ بعد کی نسلوں نے اس چراغ سے ہی اپنے چراغ روشن کیے، اس لیے میر کا یہ دعویٰ بے جا نہیں:

ہے ہمارے بھی طور کا عاشق
جس کسی کو کہیں ہوا ہے عشق

میر حسن کی اصل شہرت و مقبولیت

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

دوسری اور آخری قسط

ایک انوکھی فن کارہ لیلا نائیڈو

وشواناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا (یوپی) 201303)

دلّی میں ایک روز لیلا نائیڈو اپنی ایک سہیلی کے ساتھ کناٹ پلیس میں خریداری کی غرض سے گئی ہوئی تھی۔ اتفاق سے ایک شوروم میں وہ اور راج کپور یکجا ہوئے۔ لیلا نے فقط ایک نظر راج کپور پر ڈالی اور شاپنگ میں مصروف ہو گئی لیکن اُس نے محسوس کیا کہ راج کپور اسے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ وہ شوروم سے باہر نکلی تو راج کپور نے اُس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پُرزہ دے دیا۔ پہلے تو وہ ششدر رہ گئی، پھر کاغذ کھول کر دیکھا تو اُس پر لکھا ہوا تھا ''کیا آپ میری فلم میں ہیروئن بننا پسند کریں گی؟ — راج کپور''۔

لیلا نائیڈو نے کبھی خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی وہ اپنے وطن کے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوگی لیکن تقدیر کی کروٹ نے اُسے ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا جس کا خواب تک اسے کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اُسے ہندوستانی فلموں میں ہیروئن کا کردار نبھانے کا موقع میسر آئے گا۔

کچھ دنوں بعد وہ بمبئی گئی تو آر کے اسٹوڈیو چیمبور پہنچی جہاں اُس کا اسکرین اور ساؤنڈ ٹسٹ لیا گیا۔ یہ مراحل طے کرنے اور ٹسٹ میں پاس ہونے کے بعد راج کپور نے اُسے لیڈنگ رول ادا کرنے کی آفر دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط رکھ دی کہ اُسے لگاتار آر کے فلمز کی آٹھ فلموں میں کام کرنا ہوگا۔ راج کپور اسے نرگس جیسا مقام دینا چاہتا تھا جو کہ آر کے فلمز کی شروع کی تمام فلموں آگ، برسات، آوارہ، چار سو بیس اور آہ کی لیڈنگ لیڈی تھی۔ اس شرط نے لیلا کے ہوش اُڑا دیے کیوں کہ وہ اس طرح کا کنٹریکٹ کر کے ایک ہی ہاؤس سے بندھے رہنے کی قائل نہیں تھی۔ اُس نے ہیروئن بننے کی آرزو دل سے نکال دی اور اپنے گھر واپس آگئی۔

گردشِ لیل و نہار جاری رہی اور وقت کروٹیں بدلتا رہا۔ یورپ کے ایک سفر کے دوران لیلا پیرس سے جینوا جا رہی تھی۔ اسی ہوائی جہاز میں بلراج ساہنی بھی سفر کر رہا تھا اور اُسے جینوا پہنچنا تھا۔ دونوں کی سیٹیں اتفاق سے ساتھ ساتھ تھیں۔ لیلا بلراج ساہنی کو نہیں جانتی تھی کیوں کہ جب تک اُس نے اس بڑے فن کار کی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ دورانِ گفتگو اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک عظیم اداکار سے محوِ گفتگو ہے۔ دونوں میں کافی باتیں ہوئیں، جب سفر اختتام کے قریب پہنچا تو لیلا نے کہا ''بلراج جی! اگر بھگوان کو منظور ہوا تو ایک روز میں آپ کے ساتھ ہیروئن کا رول نبھاؤں گی'' اس پر بلراج مسکرا دیے۔

فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر رشی کیش مکرجی اپنی اگلی فلم 'انورادھا' کے لیے ایک نئی ہیروئن کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے ایک روز لیلا کا ایک فوٹو اس کی سہیلی کے گھر دیکھا اور فوراً ہی بولے ''ایک لمبے عرصے سے میں ایسی ہی لڑکی کی تلاش میں ہوں، مجھے اسی شکل و صورت کی لڑکی درکار ہے، مجھے اس سے ملواؤ''۔ سہیلی نے لیلا کی ملاقات مکرجی سے کرائی۔ تقدیر کے پھاٹک کھل گئے اور لیلا ایک بڑے ہدایت کار کی اگلی فلم 'انورادھا' کی ہیروئن بن گئی۔

پہلے روز جب وہ فلم اسٹوڈیو پہنچی تو وہاں میک اپ روم میں اس کی ملاقات بلراج ساہنی سے ہوئی جو اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے پوچھا ''تم نے راج کپور کا کنٹریکٹ ٹھکرا دیا تھا، 'انورادھا' کے لیے کنٹریکٹ کس طرح طے ہوا''۔ لیلا نے سارا واقعہ سنا دیا۔ دونوں میں دوستی ہو گئی۔ بلراج نے وعدہ کیا کہ وہ ہر طرح سے اس کی مدد کریں گے اور اُسے انڈسٹری میں اپنا کیریر بنانے میں تعاون دیں گے۔

فلم 'انورادھا' میں لیلا کو اپنا رول بہت پسند تھا۔ جب فلم میں اپنے رول کے بارے میں بات چل رہی تھی تو اسکرپٹ سن کر اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا تھا۔ وہ ایسے ہی جذباتی رول کی تلاش میں تھی۔ فلم کی شوٹنگ کے دنوں میں وہ اکثر عالمِ بے خودی میں انورادھا کے کردار میں کھو جاتی تھی اور اسے ایسا لگتا تھا کہ وہی ایک ایسی شخصیت ہے جس سے وہ پہلے ہی زندگی میں کہیں مل چکی ہے۔ اُسے جب پہلی بار انورادھا کا رول پڑھ کر سنایا گیا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ انورادھا کی زندہ تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ 'انورادھا' ایک آرٹسٹک پکچر تھی جو اعلا معیار کی تھی۔ مبصرین نے اسے خوب سراہا تھا۔ پڑھے لکھے اور باشعور لوگوں نے اس فلم کی دل کھول کر سرپرستی کی تھی۔ اسے برلن کے بین الاقوامی فلمی میلے میں مقابلے کے لیے بھیجا گیا تھا جہاں اسے اچھی فلم کا میڈل بھی ملا تھا مگر ہندوستان میں یہ باکس آفس پر کوئی کمال نہیں دکھا پائی تھی اور اس کا کاروبار توقع سے کم تھا۔

اس کے بعد لیلا نے ششی کپور کی فلم ہاؤس ہولڈر میں کام کیا جو اُس نے مرچنٹ آئی وری کے اشتراک میں تیار کی تھی اور جسے انگریزی اور ہندوستانی دونوں زبانوں میں تیار کیا گیا تھا تاکہ مغربی ممالک میں بھی اس کی نمائش ہو سکے اور یہ وہاں سے ڈالر اکٹھے کر کے لا سکے۔ قریب قریب ہر بڑے ملک میں اس کی نمائش ہوئی، لوگوں نے فلم کو پسند کیا اور اس کی ہیروئن کو بھی۔

قریب ساٹھ برس پہلے ہندوستانی پریس میں ایئر کمانڈر ناناوتی کے مقدمے کا خوب چرچا ہوا کرتا تھا جس پر اپنی شریکِ حیات کے عاشق آہوجہ کو قتل

کرنے کا الزام تھا اور اسی سے ملتی جلتی کہانی پر ایک فلم 'یہ راستے ہیں پیار کے' پہلے سے بن رہی تھی۔ دونوں میں اتفاق کے سوا کوئی رشتہ نہ تھا مگر پریس نے اس معاملے کو اتنی ہوا دی کہ لیلا نائیڈو کو اپنی پہلی اور آخری پریس کانفرنس کرکے یہ اعلان کرنا پڑا کہ فلم کا نانا وتی کیس سے کچھ تعلق نہیں۔ محبت کی یہ بھونی سی کہانی کچھ یوں تھی کہ ایئر کمانڈر سنیل دت ایک ہوائی کمپنی کا پائلٹ ہے اور لیلا نائیڈو اس کی [illegible] ہے جو اپنے پتی کی عدم موجودگی میں اپنے خاوند کے دوست رحمان کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھاتی ہے۔ شوہر کو ہرجائی بیوی کی بدچلنی کا علم ہوتا ہے تو پہلے وہ اپنے جرم کا بیان کرتے ہوئے "تم بے وفا ہو تم بے وفا ہو" کا نغمہ درد بھرے انداز میں الاپتا ہے اور پھر اپنی خانگی زندگی کا تحفظ کرنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر رحمان کے گھر پہنچتا ہے، اسے راہِ راست پر لانے کی سعی کرتا ہے مگر جب کوئی پکار کامیاب نہیں ہوتی تو وہ اپنا پستول نکال کر اس کا خون کردیتا ہے۔

اب عدالت میں مقدمے کی کارروائی کا ڈرامائی انداز میں آغاز ہوتا ہے۔ وکیل صفائی اشوک کمار عدالت میں جج کے سامنے بیان دیتا ہے کہ وہ دوستوں کی باہمی تکرار میں پستول چل گیا اور رحمان کا خون ہوگیا، مگر سرکاری وکیل موتی لال کا نظریہ کچھ اور ہے، اس کے نزدیک یہ ایک بڑا اہم نقطہ تھا کہ سنیل دت پستول لے کر رحمان کے مکان پر گیا ہی اس لیے تھا کہ اس کی زندگی کا خاتمہ کردے، لہٰذا سنیل دت کو قاتل ٹھہرایا جائے۔ مقدمے کی سماعت کے دوران فلیش بیک میں ہیرو اور ہیروئن کی محبت کے سارے واقعات دہرائے جاتے ہیں۔ گواہوں کے بیانات درج کیے جاتے ہیں اور ان پر جرح اور بحث ہوتی ہے۔ آخر میں ایک نئی سماعت کے دوران پستول عدالت میں پیش کرکے یہ ثابت کردیا جاتا ہے کہ سنیل دت بے قصور ہے۔ ہیرو تو رہا ہوگیا لیکن فلم کے ڈائرکٹر کو ابھی ایک مشکل کا حل نکالنا ہے کہ ولن رحمن کے مرنے کے بعد کس طرح ہیرو اور ہیروئن کے مابین پھر سے میل ملاپ کی صورت پیدا کی جائے اور تمام غلط فہمیاں رفع کردی جائیں۔ ایک سچے واقعے کو فلمی روپ دے کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔ اصل واقعے کا ملزم جیل میں عمر قید کاٹ رہا تھا لیکن فلمی ملزم جیل سے رہا ہوکر آزاد پھر رہا تھا۔

فلم میں نئے دور کی اونچی سوسائٹی کی مخلوط پارٹیاں، بال روم ڈانس، تاش کی بازیاں، مغرب زدہ افراد کے طور طریقے دکھا کر ماڈرن سوسائٹی کو بدنام کیا گیا۔ مغربی تہذیب کی برائیاں اجاگر کی گئیں۔ عورتوں کے کلب جانے، شوہر کے دوستوں کے ساتھ آزادانہ ملنا جلنا اور مراسم استوار کرنا، نامحرم مردوں کے ساتھ عورتوں کا گھومنا پھرنا یہ سب ماڈرن سوسائٹی کے کرشمے ہیں جو نئی تہذیب کے پرستاروں کو دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ لیکن سب قصور مغربی تہذیب کے گلے مڑھ دینا ناواجب ہے۔ ہماری اپنی تہذیب میں بھی بعض خامیاں ہیں جنھیں دور کرنا لازمی ہے۔ اپنے کردار میں بھی تبدیلی پیدا کرنی ہوگی لیکن ہدایت کار نے یک طرفہ نظریہ پیش کیا اور گہرائی میں جاکر غیر جانبداری سے کوئی نتائج پیدا نہ کرسکا۔

بہرحال فلم اچھی تھی کیوں کہ اس میں نئے ڈھنگ کی کہانی پیش کی گئی تھی اور کئی موڑ پیچ دیے گئے تھے۔ عدالت کے مناظر دیگر ہندستانی فلموں سے بہتر تھے اور انھیں حقیقی رنگ میں پیش کرنے کی دیانت دارانہ کوشش کی گئی تھی۔ لیلا نائیڈو، سنیل دت، رحمن، اشوک کمار، موتی لال سبھی کی اداکاری عمدہ اور معیاری تھی اور کسی کے کام میں بناوٹی پن نہیں تھا۔ ایک پیچیدہ اور نئے موضوع کو ہدایت کار آر کے نیر نے ہینڈل کرنے میں کوئی مہارت تو نہیں دکھائی تھی مگر وہ بالکل ناکام بھی نہیں رہا تھا۔ بغیر شور شرابے کے ہلکے پھلکے گیت تھے جسے میوزک ڈائرکٹر روی نے اچھی دھنوں سے سنوارا تھا۔ راجندر کرشن نے ایک بار پھر صاف ستھرے گیت لکھ کر اپنی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔

فلم کی ایک بہت بڑی خوبی اس کے اردو مکالمے تھے جو آغا جانی کاشمیری نے ادبی انداز میں تحریر کیے تھے۔ فلم کے ابتدائی منظر میں جب ایک آبرو باختہ عورت کو سنگ ساری کی سزا دی جاتی ہے جو مکالمے پس پردہ بولے گئے وہ ہال میں سناٹا پیدا کردیتے تھے۔ مکالمے کسی بھی فلم کا پانچواں ستون ہوتے ہیں اور 'یہ راستے ہیں پیار کے' کا یہ ستون بڑا مضبوط تھا جس کے باعث یہ فلم ہر اعتبار سے اچھی ثابت ہوئی۔ آغا جانی کاشمیری اردو کے مانے ہوئے افسانہ نویس اور مکالمہ نگار تھے اس لیے قارئینِ 'ہماری زبان' سے انھیں متعارف کرانا برحق ہے۔

آغا جانی ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے ایک نامور سید گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ لڑکپن سے اسٹیج ڈرامے دیکھنے کے مشتاق تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی سید علی رضوی تھا جو ہیرے جواہرات کی تجارت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو تھیٹر کی دنیا سے دور رکھنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ یہ شوق جاری رکھ کر وہ کبھی کامیاب تاجر نہیں بن سکے گا مگر سب نصیحتیں بیکار ثابت ہوئیں۔

والد کے انتقال کے بعد آغا جانی اپنی بڑی ہمشیرہ کے پاس رہنے لگے۔ وہ حضرت بیدل لکھنوی کے شاگرد بن گئے اور شاعری کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ان کا شمار لکھنؤ کے اچھے شاعروں میں ہونے لگا اور انھیں مشاعروں میں مدعو کیا جانے لگا۔ وہ فلم انڈسٹری میں قدم جمانے کے خواہش مند تھے اور حضرت علامہ آرزو لکھنوی کی طرح فلمی دنیا میں مقبول ہونا چاہتے تھے مگر بہن نے انھیں اجازت نہیں دی بلکہ ڈانٹ پلائی۔ آغا جانی نے بطور احتجاج کھانا پینا بند کردیا اور دو دن تک بھوکے پیاسے رہے۔ بہن کا دل پسیج گیا اور انھیں قسمت آزمانے کی اجازت دے دی۔ ان دنوں کلکتہ کی فلمی صنعت میں میڈن تھیٹرز کا نام گونج رہا تھا جس کے مالکان پارسی تھے۔ آغا جانی کے پاس کوئی سفارش نہیں تھی اس لیے کام نہ بن سکا۔ فلمی شاعر بننے کا سپنا ادھورا رہ گیا۔ انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور برما فلم کمپنی میں اداکار کی حیثیت سے نوکری کرلی۔ رنگون پہنچ کر انھوں نے فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنے شروع کردیے۔ رنگون کی زندگی انھیں راس نہیں آئی، رہائش کا انتظام ناقص تھا، برمی کھانا بھی انھیں راس نہیں آیا، ماحول سراسر غیر ادبی تھا لہٰذا وہ مایوس ہوکر واپس اپنی بہن کے گھر لکھنؤ پہنچ گئے۔

فلموں کا کیڑا ان کے دماغ سے نکلا نہیں تھا۔ کچھ روز بعد ایک بار پھر کلکتہ جانے کا عزم کیا۔ اس بار کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ اداکاری کے میدان میں سابقہ تجربے کی بنا پر انھیں میڈن تھیٹرز کی فلم 'سہانی صبح' میں ہیرو کا کردار نبھانے کا چانس مل گیا۔ بعد ازاں 'جوانی کا نشہ' اور 'آئینہ' فلموں میں ولن کا کردار انجام دیا۔ اداکاری ان کی مجبوری تھی۔ اصلاً وہ اسکرین پلے رائٹر بننے کے آرزومند تھے۔ وہ کہانی اور مکالمے کی دنیا میں نام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بمبئی کا ٹکٹ کٹایا، بمبئی کی فلم نگری کو ان دنوں اچھے اردو رائٹرز کی اشد ضرورت تھی کیوں کہ منشی قسم کے قلم کاروں نے فلمی مکالموں کا معیار بہت پست کردیا تھا۔ وہ سوشل فلموں کے مکالمے بھی تھیٹریکل انداز میں لکھتے تھے جو سراسر غیر فطری محسوس ہوتے تھے۔

آغا جانی کاشمیری بمبئی ٹاکیز کے مالکان ہمانسو رائے اور دیویکا رانی سے ملے اور اپنی ایک کہانی سنائی جسے دونوں نے بہت پسند کیا۔ یہی کہانی کمپنی کی جانب سے 'وچن' کے نام سے فلمائی گئی جس میں دیویکا رانی اور اشوک کمار نے مرکزی کردار ادا کیے۔ فلم ہٹ ثابت ہوئی اور آغا جانی کے قدم بمبئی کی فلم نگری میں مضبوطی سے جم گئے۔ اس کے بعد انھوں نے سہراب مودی کے ادارے منروا مووی ٹون کے لیے 'بھروسہ' اور 'بھول' فلموں کی کہانیاں لکھیں، پھر نیشنل اسٹوڈیوز میں چلے گئے اور اس کی تین فلموں 'نئی روشنی'، 'لالہ جی' اور 'آسرا' کے اسکرپٹ تحریر کیے۔ رنجیت مووی ٹون کے لیے 'اقرار' لکھی جو خوب چلی۔ ہر طرف ان کے نام کا طوطی بولنے لگا۔ ان کی مقبولیت سے متاثر ہوکر ہدایت کار محبوب خاں نے ان سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی، وہ عام کہانیوں سے الگ کوئی انوکھی کہانی چاہتے تھے اور بہت اچھا معاوضہ دینے پر آمادہ تھے۔ آغا جانی اطمینان سے کہانی لکھنے کی خاطر کچھ دن کے لیے لکھنؤ چلے گئے جہاں کے نوابی ماحول میں بیٹھ کر انھوں نے فلم 'نجمہ' کی کہانی، مکالمے اور اسکرین پلے قلم بند کیے۔ فلم مکمل ہوکر اس قدر مقبول ہوئی کہ پوری فلمی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم جاری تھی اور لوگ خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ 'نجمہ' کا تفریحی پہلو اس قدر نمایاں تھا کہ لوگوں کے دلوں سے ڈھائی گھنٹے کے لیے جنگ کی دہشت رفع ہوگئی۔ آغا جانی کو بطور رائٹر فلم کا پہلا انعام سونے کا تمغہ ملا۔ اشوک کمار، وینا، یعقوب اور ستارہ 'نجمہ' کی کاسٹ میں شامل تھے۔ لکھنوی نواب کے رول میں اشوک کمار کے کام کو بہت پسند کیا گیا۔ 'نجمہ' سے پہلے محبوب کی کسی فلم نے اتنا پیسہ نہیں کمایا تھا۔ اس کے بعد آغا جانی نے محبوب کے لیے لگاتار چار فلمیں تقدیر، انمول گھڑی، ہمایوں اور انوکھی ادا لکھیں۔

آغا جانی کاشمیری دیگر کئی فلمی اداروں سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے چندر لیکھا، مینا بازار، لاجواب، ناگن، سجاتا، نور جہاں، چوری چوری فلمیں لکھیں۔ ان کی تحریر کردہ فلموں میں پانچ نے گولڈن جوبلی اور تین نے سلور جوبلی منائی۔ اتنی بڑی کامیابی آج تک فلم انڈسٹری میں کسی رائٹر کو نہیں ملی۔ آغا صاحب ہر کام سلیقے اور نزاکت سے کرتے تھے، میٹھا بولتے تھے اور اتنی شیریں زبان لکھتے تھے جو دل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کی بیگم صاحبہ کو بھی اردو پر دسترس حاصل تھی جس کا ذکر اداکار اوم پرکاش نے اپنی فلم 'گیٹ وے آف انڈیا' میں کیا تھا۔ منظر یوں تھا کہ اوم پرکاش ایک خاتون سے کہہ رہے ہیں: "تم اردو اس طرح فرفر بول رہی ہو جس طرح بیگم آغا جانی کاشمیری بولتی ہیں"۔ کسی زمانے میں بمبئی کے فلمی حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ صحیح اردو سیکھنی ہے تو رابعہ مہدی علی خاں کے پاس جاؤ یا پھر بیگم آغا جانی کاشمیری سے سیکھو۔ کافی پرانی بات یہ بھی ہے کہ آغا جانی کا بیٹا ذاکر حسین انگریزی زبان کا جرنلسٹ تھا اور کینیڈا کے ایک روزنامے میں کام کرتا تھا۔ اسے کینیڈا کے اخبار نویسوں کی انجمن نے اعلا صحافتی خدمات کے عوض ایک اہم ایوارڈ بھی دیا تھا۔

فلمی دنیا میں اردو زبان کا نام روشن کرنے والے سبھی بڑے شاعر اور ادیب ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ اب صرف دو بڑے قلم کار باقی ہیں، گلزار اور جاوید اختر جن کے دم سے اردو کی آبرو تھوڑی باقی ہے، صورت حالات یہ ہوگئی ہے کہ ہر شاخ پہ الّو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا۔ فلمی شاعری دم توڑ چکی ہے اور مکالموں کا ناس تو کیا سوا ستیاناس ہوچکا ہے۔ راقم کا عمر بھر معمول رہا کہ وہ ہر فلم دیکھا کرتا تھا۔ اب فلم کے مکالمات اور نغمے سن کر دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں اس لیے مہینے بھر میں مشکل سے ایک ہی فلم دیکھ پاتا ہوں جس کے بارے میں بھروسہ ہو کہ اس کا ادبی معیار کچھ بہتر ہوگا۔ عام طور پر مایوسی ہی ہاتھ آتی ہے۔ محترمہ شبانہ اعظمی بھی کچھ ماہ پہلے فلموں میں اردو کے گرتے ہوئے معیار پر بیان جاری کرچکی ہیں۔

•••

اردو دُنیا

اردو کے لیے الگ سے ایک دن کی خصوصی ورکشاپ منعقد کرانے کا حکم

نئی دہلی (۸ مئی) نہ دہلی سرکار کے محکمہ تعلیم کی جانب سے ۳ مئی تا ۸ مئی نویں جماعت سے بارہویں جماعت تک سپورٹنگ میٹریل پر دوبارہ غور کرنے اور نیا میٹریل تیار کرنے کی غرض سے منعقد کیے گئے ایک سیمینار/ ورکشاپ میں اردو زبان کو شامل نہ کیے جانے پر آج دہلی کی وزیر تعلیم پروفیسر کرن والیہ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور جواب طلب کیا۔ قابل ذکر ہے کہ 'راشٹریہ سہارا' نے اپنی کل کی اشاعت میں اس جانب توجہ مبذول کرائی تھی کہ اس میں اردو مضمون کو شامل نہیں کیا گیا ہے جب کہ گزشتہ سال اس بات کا وعدہ کیا گیا تھا کہ اردو مضمون کے لیے بھی سپورٹنگ میٹریل تیار کرایا جائے گا۔

اس سلسلے میں آج دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع نے سکریٹری تعلیمات، دہلی سرکار کو توجہ دلائی۔ سکریٹری تعلیمات نے یقین دہانی کرائی ہے کہ اردو مضمون کے لیے الگ سے ایک دن کا خصوصی ورکشاپ جلد ہی کرایا جائے گا۔

دوسری جانب دہلی کی وزیر تعلیم پروفیسر کرن والیہ نے اس سلسلے میں ایجوکیشن ڈائرکٹر سے جواب طلب کرکے انھیں ہدایت دی کہ وہ فوری طور پر اردو کی ایک علاحدہ ورکشاپ منعقد کریں۔ انھوں نے کہا کہ چھٹیوں کی وجہ سے اس میں کچھ تاخیر ہوگی ہے مگر اردو جیسی شیریں زبان کو کسی بھی طرح محروم نہیں رکھا جائے گا۔ قابل ذکر ہے کہ 'راشٹریہ سہارا' روزنامہ میں اس بارے میں خبر شائع ہونے کے بعد آج اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پدم شری پروفیسر اخترالواسع اور سکریٹری انیس اعظمی نے وزیر تعلیم پروفیسر کرن والیہ سے ملاقات کرکے انھیں صورت حال سے واقف کرایا اور اردو کے ساتھ کیے گئے امتیازی سلوک سے انھیں آگاہ کیا جس پر کرن والیہ نے فوری ایکشن لیتے ہوئے ہدایت جاری کی۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اترپردیش کے اعلاتعلیمی اداروں میں اردو اساتذہ کی کمی کا معاملہ

گورکھپور (۸ مئی)۔ گورکھپور یونیورسٹی، گورنمنٹ جوبلی کالج، گورنمنٹ ڈگری کالج کھجنی اور اسلام یانڈہ ڈگری کالج میں اردو اساتذہ کی کمی کے باعث طلبہ کو ہو رہی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے ساجد علی میموریل کمیٹی کے سکریٹری محبوب سعید حارث نے ریاست کے گورنر کو ایک فیکس ارسال کیا ہے جس میں اردو زبان و ادب کے طلبہ کی تعلیم سے متعلق مسائل کو حل کرانے کی اپیل کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ اساتذہ کا معقول انتظام نہ ہونے سے طلبہ میں مایوسی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس جانب بار بار توجہ مبذول کرانے کے باوجود اب تک کوئی کارروائی نہیں ہوسکی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اردو اکیڈمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کی تشکیل کی جانب بھی گورنر موصوف کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مدرسہ بورڈ کی ابھی تک تشکیل نہ ہونے پر انھوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دیگر اداروں میں تو آئے دن بے ضابطگیاں ہو رہی ہیں تو پھر اب تک مدرسہ بورڈ کی تشکیل کیوں نہیں کی جا سکی ہے۔ مسٹر حارث نے مزید لکھا ہے کہ پرائمری درجات میں بھی اساتذہ کی تقرری میں تیزی لائی جائے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سرکاری ادارے محض معطل ہو کر رہ گئے ہیں۔ چیف سکریٹری نے ۳۰ جون تک تقرری کے احکام جاری کردیے ہیں لیکن یہ کام سست رفتاری سے ہو رہا ہے جس سے وقت مقررہ تک یہ کام مکمل ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ اردو زبان کے ساتھ موجودہ ریاستی حکومت کے رویے سے اردو والے حلقے میں بے چینی پائی جارہی ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو پرائمری ٹیچرز ریکروٹمنٹ ٹسٹ

ڈی ایس ایس ایس بی نے ویب سائٹ پر کئی سوالات کے غلط جواب ڈالے

نئی دہلی (۱۱ مئی)۔ ڈی ایس ایس ایس بی کے تحت ۲۸ اپریل کو لیے گئے اردو پرائمری ٹیچرز ریکروٹمنٹ ٹسٹ کے بعد امیدواروں کو سوالات کے صحیح جواب بتانے کے لیے بورڈ نے اپنی ویب سائٹ پر جو جواب ڈالے ہیں ان میں کئی سوالات کے جوابات غلط ہیں، جو بورڈ کی لاپروائی کی مثال ہے۔ واضح ہو کہ ڈی ایس ایس ایس بی کے تحت گزشتہ ۲۸ اپریل کو اردو پرائمری ٹیچرز کے لیے امتحان منعقد کیا گیا تھا۔ امتحان میں ہر سوال کے نیچے چار جواب درج ہوتے ہیں جن میں سے امیدوار کو صحیح جواب کے آگے نشان لگانا ہوتا ہے۔ امتحان ہوجانے کے بعد بورڈ اپنی ویب سائٹ پر امیدواروں سے پوچھے گئے سوالات کے صحیح جوابات بھی پیش کرتا ہے جو اس نے اس بار بھی کیا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بورڈ نے جن جوابوں کو صحیح قرار دیا ہے ان میں کئی جواب غلط ہیں۔ مثال کے طور پر بورڈ نے ویب سائٹ پر جو صحیح جواب ڈالے ہیں ان میں ایک سوال (نمبر 178) ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا مخفف بتایئے۔ اس کے نیچے چار جواب دیے گئے ہیں جن میں سے کسی ایک پر امیدوار کو صحیح کا نشان لگانا ہے۔ بورڈ نے اس کا صحیح جواب CPUL دیا ہے، جب کہ صحیح جواب NCPUL ہے۔ اسی طرح سوال نمبر 200 میں پوچھا گیا ہے کہ شمسی نظام کا وہ سیارہ جس میں ذی روح کائنات کا وجود ہے؟ اس کے چار جواب پیش کیے گئے ہیں: عطارد، مریخ، زمین اور زہرہ۔ بورڈ نے صحیح جواب 'مریخ' درج کیا ہے جب کہ اس سوال کا صحیح جواب 'زمین' ہے۔ سوال نمبر 151 میں پوچھا گیا ہے کہ NCF-2005 میں بچے کے پہلے دو سال میں ذریعہ تعلیم کے طور پر کون سی زبان رکھنے پر زور دیا گیا ہے؟ اس کے چار جواب دیے گئے ہیں: مادری زبان، قومی زبان، علاقائی زبان اور انگریزی۔ ان میں سے بورڈ نے صحیح جواب 'علاقائی زبان' درج کیا ہے جب کہ اس کا صحیح جواب 'مادری زبان' ہے۔ اسی طرح کے کچھ اور بھی سوالات ہیں جن کے بورڈ نے غلط جواب درج کیے ہیں۔ اس غلطی کے سامنے آنے کے بعد اس امتحان میں بیٹھنے والے امیدواروں میں کافی ناراضگی ہے کیوں کہ امتحان میں میرٹ پر آنے کے لیے ایک ایک نمبر بہت اہمیت رکھتا ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

سرکاری اسکولوں میں اردو کا بھی استعمال ہو

میرٹھ (۸ مئی)۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کی طرف سے یہاں چیمبر آف کامرس بمبئی بازار میں سیمینار منعقد کیا گیا جس میں اردو کے پروموشن اور اسکول چلو مہم کو کامیاب بنانے پر زور دیا گیا۔ سیمینار میں تعلیم اور سماج کے لیے کام کرنے والے تین افراد کو اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ سیمینار میں مہمان خصوصی ریاست کے وزیر مملکت شاہد منظور نے والدین سے بچوں کو اسکول بھیجنے کی اپیل کی جب کہ سی ڈی او راوے شیام مشرا نے کہا کہ اساتذہ پرائمری اسکولوں میں ہندی کے ساتھ اردو کا بھی استعمال کریں۔ بی ایس اے جیویندر سنگھ بری نے اسکول چلو مہم کو مضبوطی فراہم کرنے کا اعلان کیا۔ ایسوسی ایشن کے صوبائی کنوینر محمد صابر خاں نے بتایا کہ تنظیم قیام کے بعد سے ہی اردو کو فروغ دینے کے لیے کوشش کررہی ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کا تقرر ضروری

جی او 472 پر فی الفور عمل کا مطالبہ، پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن کا بیان

حیدرآباد (۹ مئی)۔ آندھرا پردیش پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن نے ریاست کے سرکاری مدارس بالخصوص اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ و طلبہ کی تعداد کے تناسب سے جی او ایم ایس نمبر 472 جاری کردہ مورخہ ۲ جولائی ۱۹۷۷ء کو فی الفور روبہ عمل لانے کا ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا۔ بہ صورت دیگر بڑے پیمانے پر ریاست بھر میں احتجاج منظم کرنے بلکہ عدلیہ سے بھی رجوع ہونے کا انتباہ دیا۔ اس سلسلے میں مسٹر سید شوکت علی صدر والے پی پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن نے چند دن قبل ہی پرنسپل سکریٹری اسکول ایجوکیشن سے ملاقات کرکے ایک تفصیلی یادداشت پیش کی اور پرنسپل سکریٹری ریاستی محکمہ اسکول ایجوکیشن کو اردو میڈیم مدارس میں اساتذہ و طلبہ کے تناسب سے متعلق واضح کردیا ہے کہ اردو میڈیم مدارس میں اگر ایک کلاس میں دس طلبہ موجود ہوں تو ان کے لیے ایک ٹیچر کی تعیناتی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ریاستی محکمہ تعلیم میں اس جی او کو نظرانداز کرکے ایک نیا جی او ایم ایس نمبر 55 مورخہ ۲۳ اپریل ۲۰۱۱ء جاری کیا گیا اور اس جی او میں سابقہ جی او نمبر 472 کا حوالہ تک نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے موجودہ حالات میں جاری کردہ جی او میں ایک ٹیچر کے لیے 20 طلبہ کی موجودگی کا لزوم عائد کیا گیا جو صریحاً ریاستی حکومت کی جانب سے جاری کردہ جی او نمبر 472 کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ مسٹر شوکت علی نے مزید کہا کہ اردو میڈیم مدارس میں ریشنلائزیشن (معقولیت پسندی) کے نام پر اردو میڈیم اساتذہ کی اسامیوں کو گھٹانے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے اور اسی ریشنلائزیشن کی روشنی میں اساتذہ کے تبادلوں کے لیے جس کونسلنگ کے شیڈول کا اعلان کیا گیا اس میں اساتذہ کی اسامیوں کو کم کرتے ہوئے انھیں زبردستی تبادلوں کی کونسلنگ میں درخواست پیش کرنے کی ہدایت دی جارہی ہے جو کہ صریحاً ظلم اور ناانصافی ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

قارئین 'ہماری زبان' سے درخواست

رشید حسن خاں مرحوم نے اپنے آخری دنوں میں 'غرائب اللغات' پر ایک مضمون لکھا تھا، جس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک خط میں کیا ہے کہ "وہ مضمون ایک پرچے کو بھیج دیا ہے بہت جلد شائع ہوجائے گا"۔ ہمیں اس مضمون کی تلاش ہے۔ چناں چہ 'ہماری زبان' کے قارئین سے درخواست ہے کہ اگر یہ مضمون کسی کے پاس ہو تو براہ کرم اس کی نقل فراہم کریں۔

جاوید رحمانی

336 AB Budh Vihar,
Opp. JNU Campus
New Delhi - 110067
Mob. No. 09971854826
E-mail: rahmanijnu@gmail.com

اکادمیوں کے ذریعے تقرر اساتذہ کی تنخواہ میں دوگنا اضافہ

اردو پی جی ٹی اساتذہ کو 23265 روپے اور ٹی جی ٹی کو 22935 روپے ماہانہ دینے کا فیصلہ

نئی دہلی (۱۳؍مئی)۔ دہلی کابینہ نے سرکاری اسکولوں میں لنگوئیجز اکادمیوں کے ذریعے تعینات اردو، سنسکرت اور پنجابی اساتذہ کی ماہانہ تنخواہ میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے سے ان اساتذہ کی تنخواہ اب موجودہ تنخواہ سے دوگنی سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ سبکدوشی کے بعد پنشن یافتہ پھر سے تقرر کیے گئے اساتذہ کو سرکاری رہائش گاہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کی صدارت میں آج ہوئی کابینہ کی میٹنگ میں اکادمیوں کی جانب سے تقرر کیے گئے اساتذہ کی ماہانہ تنخواہ اور سبکدوش اساتذہ کو سرکاری رہائش گاہ سے متعلق تجویز پیش کی گئی تھی۔

کابینہ کی میٹنگ کے بعد صحافیوں کو جانکاری دیتے ہوئے وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے بتایا کہ دہلی سرکار نے لنگوئیجز اکادمیوں سے اردو، پنجابی اور سنسکرت اساتذہ ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ کے تحت تعینات کیے تھے۔ ان اساتذہ کو زبان کو فروغ دینے کے پروگرام کے تحت تعینات کیا گیا تھا۔ ماضی میں ان اساتذہ کو اسکولوں میں خالی ہوئی اساتذہ کی اسامیوں پر کنٹریکٹ کے طور پر لگایا گیا تھا لیکن بعد میں ۲۰۰۸ء میں تمام اساتذہ کو مستقل کر دیا گیا۔ ان اساتذہ کی یک مشت ماہانہ تنخواہ جولائی ۲۰۰۳ء، اپریل ۲۰۰۵ء اور اپریل ۲۰۰۷ء میں کنٹریکٹ اساتذہ رہتے ہوئے بڑھائی گئی تھی۔ جولائی ۲۰۰۸ء میں اسکولوں میں خالی اسامیوں پر مستقل کرتے ہوئے اساتذہ کی تنخواہ بڑھائی گئی۔ اس وقت پی جی ٹی اساتذہ کی یک مشت تنخواہ 13,160/- رکھی گئی تھی جب کہ ٹی جی ٹی عہدے والے اساتذہ کی تنخواہ یک مشت 11,140/- طے کی گئی تھی۔

کابینہ کے آج کے فیصلے کے مطابق اب پی جی ٹی اساتذہ کو اضافی تنخواہ کے طور پر 23,265 روپے ملیں گے جب کہ ابھی تک انھیں 13000 روپے مل رہے تھے۔ اسی طرح اب ٹی جی ٹی اساتذہ کو اضافی تنخواہ کے طور پر 22,935 روپے ماہانہ تنخواہ ملے گی جب کہ ابھی تک انھیں 11,140 روپے ہی مل رہے تھے۔

کابینہ کے فیصلے سے کل 282 لنگوئیجز اساتذہ کی یک مشت رقم بڑھ کر دوگنی سے زیادہ ہو گئی ہے۔ سرکار کے اس فیصلے سے اساتذہ کو کافی راحت ملے گی۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

نمائش کے پروگراموں سے اردو کو ختم کرنے کی سازش

مرادآباد (۲۰ مئی)۔ اگر آپ مرادآباد کی پہچان کے بارے میں کسی سے بھی سوال کریں گے تو وہ جگر مرادآبادی اور گہوارۂ اردو کہہ کر کے اس شہر کی شناخت کرائے گا، لیکن ایک طویل مدت سے گنگا کے کنارے آباد یہ گنگا جمنی تہذیب کا مرکز حال ہی میں اپنی ادبی شناخت کھوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ شہر میں کچھ اردو مخالف اور متعصب لوگوں کا وجود میں آنا ہے۔ اس کی ایک نظیر نمائش میں بھی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں اس نمائش کی شروعات جب ہوئی تھی تو اس پروگرام میں اردو سے متعلق ایک نہیں بلکہ چار چار پروگرام ہوا کرتے تھے جن میں دو مشاعرے، ایک پروگرام قوالی اور ایک چاربیت کا پروگرام شامل تھا۔ دو مشاعروں میں ایک آل انڈیا مشاعرہ اور دوسرا عظیم الشان مشاعرہ شامل تھا لیکن اس وقت کی اگر بات کی جائے تو اس وقت عظیم الشان مشاعرے کا قد گھٹا کر ڈویژنل مشاعرہ کر دیا گیا اور اس میں کوی سمیلن کو بھی شامل کر دیا گیا اور قوالی اور چاربیت کے دونوں پروگراموں کو بالکل ختم کر دیا گیا حالاں کہ آل انڈیا مشاعرے سے تو کوی سمیلن کو الگ کر دیا گیا اور سال ۲۰۱۲ء میں یہ دونوں پروگرام الگ الگ ہی ہوئے لیکن عظیم الشان مشاعرہ جسے گھٹا کر ڈویژنل مشاعرہ کر دیا گیا تھا، اس میں کوی سمیلن شامل رہا۔ ان تمام باتوں کو لے کر شہر کا اردو نواز اور ادب نواز طبقہ ناراض ہے۔

موجودہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنجے کمار اور ایس ایس پی چوں کہ ادبی ذوق سے سرشار افسران میں شمار کیے جاتے ہیں اس لیے ان دونوں افسران سے بڑی امیدیں ہیں کہ شاید اس بار نمائش میں ان دونوں افسران کے ذریعے عظیم الشان مشاعرہ، قوالی اور چاربیت کا پروگرام پھر سے شروع ہو جائے۔

(انقلاب۔ دہلی)

کارپوریشن میں اردو مترجم کی تقرری جلد

کلکتہ۔ کلکتہ کارپوریشن کے میونسپل کمشنر خلیل احمد نے ٹاؤن ہال میں منعقد ایک استقبالیہ تقریب میں اس بات کی خوشخبری دی کہ کارپوریشن نے شہر کی تمام مساجد کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ اردو کو شہر میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اس لیے کارپوریشن نے دفتر کے کام کاج کے لیے ایک اردو مترجم کے عہدے کو منظوری دی ہے اور اس کے لیے باضابطہ تقرری ہوگی۔ واضح ہو کہ گورنر کے دستخط کے بعد ۱۵؍مئی سے ریاست کے ان علاقوں میں جہاں اردو آبادی دس فیصد یا اس سے زائد ہے وہاں اردو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

معروف اسکالر اصغر علی انجینئر کی وفات پر

اردو گھر میں تعزیتی جلسہ

نئی دہلی (۱۵؍مئی)۔ ممتاز اسکالر، صحافی اور دانش ور جناب اصغر علی انجینئر کا طویل علالت کے بعد ۱۴؍مئی ۲۰۱۳ء کو ممبئی میں انتقال ہو گیا۔ وہ 74 برس کے تھے۔ ان کی وفات پر ۱۵؍مئی ۲۰۱۳ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی، جس میں سب سے پہلے انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اصغر علی انجینئر کی وفات سے ترقی پسند اور سیکولر طاقتیں ایک اہم دانش ور اور مفکر سے محروم ہو گئی ہیں۔ مرحوم نے ملک و قوم کی ترقی اور بہی خواہی کے لیے اپنے کو وقف کر رکھا تھا۔ انھوں نے بے شمار مضامین مذہب، سیاست اور سماج کے مسائل پر لکھے۔ وہ عورتوں کے حقوق کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہے۔ بلاشبہ اصغر علی انجینئر کی وفات ملک و قوم کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔

سہ ماہی 'اردو ادب' کے اڈیٹر ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ اصغر علی انجینئر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۶ء میں ممبئی میں ہوئی تھی، اس کے بعد ہمارے ان سے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ ان کی زندگی جدوجہد سے بھری ہوئی تھی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے لیکن بعد میں نوکری سے استعفا دے کر سماجی خدمت میں لگ گئے۔ وہ ایک بہت بڑے اسلامی اسکالر بھی تھے اور قرآن کی آیات کی بنیاد پر وہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ دنیا بھر میں سماجی خدمت گار کی حیثیت سے مدعو کیے جاتے تھے اور ہندستان میں جہاں بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے وہ خود جا کر حالات کا جائزہ لیتے تھے اور اس پر بھرپور رپورٹ لکھتے تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم جو بوجوہ اس تعزیتی نشست میں شامل ہونے سے قاصر تھے، اس لیے، انھوں نے بذریعہ فون خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اصغر علی انجینئر صاحب ایک بہت بڑے اسلامی اسکالر تھے۔ اسلامیات کے موضوع پر انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس کے علاوہ سماج کے مختلف مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور جہاں جہاں کمزور لوگوں پر ظلم و زیادتی ہوتی تھی وہ اس سے خبردار رہتے اور وہاں کا جائزہ لیتے تھے۔ وہ جس قدر مقبول تھے، اسی قدر ان کی ذات کو بہت سے خطرات بھی تھے خاص طور سے ان لوگوں کی طرف سے جن کے ظلم و زیادتیوں کے خلاف وہ برابر آواز اٹھاتے تھے۔

جناب سیّد شریف الحسن نقوی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اصغر علی انجینئر نے اسلام اور ہندستان میں فرقہ وارانہ تشدد کے موضوع پر کئی مضامین اور کتابیں لکھیں، کئی کتابیں انھوں نے آزادی کے بعد پیدا شدہ حالات پر تحریر کیں۔ انھوں نے زندگی بھر رواداری، اخوت اور قومی یک جہتی کے فروغ کے لیے جدوجہد کی۔ ان کے انتقال سے علم و ادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے فی الحال پر کیا جانا ناممکن نظر آ رہا ہے۔

جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ اصغر علی انجینئر ایک بہت اچھے اسلامی اسکالر تھے، انھوں نے ایک اصلاحی تحریک قائم کر رکھی تھی جس کے وہ بانی تھے۔ انھوں نے سماجی اور اسلامی مسائل پر متعدد مضامین اور کتابیں لکھیں۔ وہ بہت ہمت اور جرأت کے ساتھ سماجی اور سیاسی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اصغر علی انجینئر میرے بہت عزیز دوست تھے، وہ ترقی پسند اور عوامی تحریکات میں نہ صرف شامل رہتے تھے بلکہ رہنمائی بھی کرتے تھے۔ ان کی تقریر و تحریر وقف تھیں ایسے مسائل کے لیے جو آج کل سب کے ذہن پر حاوی ہیں، مثال کے طور پر فرقہ پرستی یا عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوششیں اور ان کی تعلیم و اصلاح کی طرف توجہ۔ انھوں نے بوہرہ کمیونٹی میں ایک بڑی طاقت ور تحریک کی بنیاد ڈالی۔ ان پر کا تلانہ حملے بھی ہوئے مگر وہ بڑی بے خوفی کے ساتھ سارے روشن خیال لوگوں کے اقدام کی حمایت کرتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک اچھے ادیب اور محقق تھے، انھوں نے اسلامی تاریخ کے مطالعے کے لیے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جو بہت سرگرم رہا۔

(پریس ریلیز انجمن نے ۱۵؍مئی کو جاری کی)

عادل آباد میں بھی اردو والوں کے ساتھ ناانصافی

عادل آباد (۸؍مئی)۔ ضلع مہتمم تعلیمات (ڈی ای او) عادل آباد کی سید ولا بیان دیا تھا۔ واضح ہو کہ چند ایک اردو سازش کو آج تربیت یافتہ اساتذہ اور مختلف تنظیموں کے قائدین نے اس وقت ناکام بنا دیا جب وہ ضلع عادل آباد کے اردو میڈیم مدارس کے لیے راجیو ودیا مشن کے تحت منظورہ 85 ایس جی ٹی اسامیوں میں تخفیف کرتے ہوئے صرف 49 اسامیاں ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تفصیلات کے بموجب اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا عادل آباد یونٹ کے ذمہ داران کی قیادت میں سیکڑوں تربیت یافتہ اردو میڈیم اساتذہ نے منتخب کے سیاسی اقلیتی قائدین اور سماجی تنظیموں کے ذمہ داران کے ہمراہ دفتر مہتمم تعلیمات عادل آباد پر پہنچ کر ڈی ای او سے الجھ پڑے جب انھوں نے آج چند اردو اخبارات میں اردو میڈیم کے لیے صرف 49 ہی اسامیاں منظور کرنے اخبارات کے شمارے میں ضلع عادل آباد میں اردو میڈیم کے لیے جملہ 85 اسامیوں کی منظوری پر مشتمل تفصیلی رپورٹ شائع کی گئی تھی جس کے بعد ضلع مہتمم تعلیمات نے صرف 49 اسامیاں منظور کیے جانے کی بات کہی تھی جس پر برہم طلبہ نے آج اخبارات میں شائع شدہ خبر کا حوالہ دیتے ہوئے ان سے استفسار کیا، بعد ازاں ڈی ای او جو کہ طلبہ اور اقلیتی قائدین ذمہ داران کی برہمی پر کسی قدر خوف زدہ دکھائی دے رہے تھے، نے فوری طور پر اپنی جاری کردہ دوسری فہرست کو منسوخ کرتے ہوئے اردو میڈیم کی 85 اسامیوں کی منظوری کا اعلان کیا اور انھوں نے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے طلبہ کو ان خبروں سے پہنچے دکھ پر افسوس کا اظہار کیا۔

(منصف۔ حیدرآباد)

☆☆☆

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : ادبیات راجستھان
مصنف : ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی
ضخامت : ۳۵۰ صفحات
قیمت : دوسو ساٹھ روپے
ملنے کا پتا : شیخ بک ڈپو، پانچ بتی ٹونک (راجستھان)
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

ہندستان میں مختلف ادوار کے دوران اردو ادب کی آبیاری چند اہم مراکز میں خاص طور پر ہوتی رہی جیسے دلی، آگرہ، حیدرآباد، لکھنؤ وغیرہ۔ گرچہ ٹونک راجستھان کا مقابلہ بالراست ان مراکز سے نہیں کیا جاسکتا ہے تاہم یہ بھی اردو ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ علاقائی سرگرمیوں سے آشنا ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان علاقوں میں اردو ادب کے ارتقا پر دقیقہ ریزی سے تحقیق کی جائے تاکہ وہ رود اردو کے لیے معاون دریاؤں کا کام کرسکیں۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے اس سے پہلے بھی اس سمت میں کافی کام کیا ہے اور 'راجستھان میں اردو تراجم' کے عنوان سے ایک کتاب ۲۰۰۸ء میں شائع کی ہے جب کہ ایک اور کتاب بعنوان 'تذکرہ معاصر شعرائے ٹونک' اشاعتی منازل سے گزر رہی ہے۔ زیر نظر مجموعہ جو راجستھان کی ادبی تاریخ کے حوالے سے تحریر کیے گئے مضامین و مقالات پر مشتمل ہے، اس سمت میں ایک اور اہم قدم ہے۔

'ادبیات راجستھان' پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ (۱) ادب و تاریخ (۲) تحقیق و ماخذ (۳) ادیب و شاعر (۴) طباعت و اشاعت (۵) ادبی سرگرمیاں۔ 'ادب و تاریخ' کے تحت راجستھان کی اردو صحافت، فارسی مشاہیر، ٹونک کی ادبی خدمات اور ٹونک کی خصوصی صنف سخن 'چار بیت' پر تاریخی پس منظر میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بقول مصنف "ہندوستان میں جہاں جہاں، خان فوجیوں کی چھاؤنیاں تھیں یا پٹھانوں کی آبادی تھی وہاں چار بیت کا رواج ہوا مثلاً ہندوستان میں ایسی ریاستیں ٹونک، رامپور اور بھوپال بھی تھیں جہاں پٹھانوں کی بستیاں تھیں... چار بیت کا فن جہاں ایک طرف فوجی آن بان اور حوصلہ کا ترجمان رہا ہے وہیں دلہن پرستی، انسان دوستی اور حسن و عشق کی کیفیات سے لبریز ہے۔"

'تحقیق و ماخذ' کے تحت مصنف نے ایک جانب تحقیقی، تنقیدی، تاریخی اور لسانی نقطۂ نظر سے اردو ادب میں انفرادی حیثیت رکھنے والے پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی حیات اور فن پر روشنی ڈالی ہے تو دوسری جانب بابائے اردو راجستھان ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کے کارناموں اور ان سے لیے گئے ایک انٹرویو کو بھی شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ راجستھان میں عربی، فارسی اور اردو کے ماخذ، کتب خانوں اور غیر معروف کتبات پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

'ادیب و شاعر' کے تحت راجستھان سے تعلق رکھنے والے اہم قلم کاروں کی حیات اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نام یوں ہیں: صوفی شاہ محمد ہدایت علی نقشبندی مجددیؒ؛ شاعر، رومان، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، صحافی، مترجم اور لغت نگار اختر شیرانی (بحیثیت ترجمہ نگار)؛ شعرا راسخ بیکانیری، مولانا قمر واحدی، خیراں ٹونکی، صائب ٹونکی، ندیم ٹونکی، برقی ٹونکی، فائز ٹونکی، عرس بیگی، راشد ٹونکی، جسیم ٹونکی، مخمور سعیدی، صادق بہار ٹونکی، واصف فرقانی ٹونکی، ظفر احمد خاں ظفر ٹونکی، سعید ٹونکی، ناظر ٹونکی، فراز حامدی، مختار ٹونکی، حسن طبرانی، حبیب الرحمن نیازی، ابرار احمد فائق اور عذرا نکہت۔ شعرا کے کلام کا مختصر تنقیدی جائزہ اور نمونۂ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

ذرے ذرے سے مجھے آواز آتی ہے
مل گئی ہر شے کو وہ محو نوائی جانے تو نے
(راسخ)

ہر وقت نیا طور، نئی برق تجلی
عالم ہی نرالا ہے تری جلوہ گری کا
(قمر واحدی)

جب روز ازل سلطنتوں کی ہوئی تقسیم
جاگیر حوادث کی مرے نام ہوئی ہے
(خیراں)

یہ اختلاف، یہ سازش، یہ تفرقہ، یہ غلط
دلوں سے دور کرو آدمی کی قدر کرو
(صائب)

ہستی کو راہِ مجازی میں مٹا دیا بھی
یہ بھی ہے رازِ حقیقت مجھے معلوم نہ تھا
(ندیم)

ہر ایک جادۂ حق سوئے دار جاتا ہے
جو حق کو چاہو تو اندیشۂ گلو نہ کرو
(برقی)

پھر آگئے چمن میں اگر ایک بار ہم
پیدا اسی خزاں سے کریں گے بہار ہم
(فائز)

عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک ہاتھ میں خنجر دکھائی دیتا ہے
(عرس بیگی)

صرف اک پیار کی صورت نہیں بدلی راشد
ورنہ دنیا نے کئی روپ دکھائے برسوں
(راشد)

وہ مجھ انتظار مجھے شوق بازگشت
ہونٹوں پہ آکے جانے کہاں کھو گئے حروف
(جسیم)

کتنی دیواریں اٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں
گھر کہیں گم ہوگیا ہے دیوار و در کے درمیاں
(مخمور سعیدی)

پیام امن دے کر جس کبوتر کو اڑایا تھا
وہ گھائل ہو کر آخر گر گیا ہے شاخ بن میں
(بہار)

وہ ڈالتے رہے سر و مرغ پر کمند
ہم مہ رخوں کی پتلی کمر دیکھتے رہے
(ظفر)

گھر سے نکلے تھے کہ کچھ دن تو سفر اچھا لگا
عمر بھر کی ہجرتیں دیکھیں تو گھر اچھا لگا
(فائق)

فصل چار راجستھان میں اردو کے بارے میں طباعتی اور اشاعتی کارروائی اور فارسی مخطوطہ 'تاریخ تحفہ رجھنوری' کے اردو ترجمے سے متعلق ہے جب کہ پانچویں فصل میں راجستھان کے مختلف ادبی اداروں کی سرگرمیوں، مشاعروں، سیمیناروں، ورکشاپوں اور کانفرنسوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ شاعروں اور نثر نگاروں کے کوائف اور ان کے کارناموں کی اطلاع ایجاز و اختصار کے ساتھ دی گئی ہے مگر کسی بھی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

زبان سلیس اور رواں ہے۔ عموماً ایسی تصانیف تفصیلات و تصریحات کا پلندہ بن جاتی ہیں اور ان کا مطالعہ وقت و محنت طلب ہوتا ہے مگر زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرتے وقت مجھے ایسی کسی مشکل یا دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ کوشش دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ مختصر یہ کہ زیر نظر کتاب راجستھانی اردو ادب سے متعلق ایک دستاویزی اور حوالہ جاتی درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کا ہر لائبریری میں ہونا ضروری ہے۔

●●●

نام کتاب : رسالۂ حق نما
مصنف : محمد دارا شکوہ
مترجم : عادل اسیر دہلوی
اشاعت : ۲۰۱۳ء
ضخامت : ۱۲۸ صفحات
قیمت : ۲۵ روپے
ناشر : مکتبہ بک ڈپو، ترکمان گیٹ دہلی-۶
تبصرہ نگار : ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن

عادل اسیر دہلوی اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ ادب اطفال کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازے جاچکے ہیں۔ بچوں کے ادب کے علاوہ حالیہ چند برسوں میں انھوں نے عمر خیام، سیف الدین باخرزی، دارا شکوہ، غنی کشمیری اور خواجہ میر درد کی فارسی تصنیفات کا اردو ترجمہ پیش کرکے نہ صرف اپنی علمی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے بلکہ فارسی و اردو پر اپنی مضبوط گرفت کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

دارا شکوہ، شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ولی عہد بھی مگر اورنگ زیب کے تخت نشین ہوجانے کی وجہ سے دارا شکوہ کی دیگر خوبیوں کے علاوہ اس کی علمی تصنیفات بھی لوگوں کی پہنچ سے باہر رہیں۔ عادل اسیر دہلوی نے شہزادہ محمد دارا شکوہ کی تصنیفات میں سے ایک 'رسالۂ حق نما' کا اردو ترجمع فارسی متن پیش کرکے اردو والوں کو نہ صرف چونکا دیا ہے بلکہ دارا شکوہ کی اس عظمت سے بھی باخبر کردیا ہے جو عوام الناس سے تو پوشیدہ تھی ہی خواص بھی بہت کم اس سے واقف تھے۔ اگر عادل اسیر دہلوی نے یہ رسالہ مجھے نہ بھیجا ہوتا تو میں بھی دارا شکوہ کی علمی و روحانی فتوحات سے بے خبر رہتا۔

'رسالۂ حق نما' فارسی کی ضخامت 19 صفحات ہے، اردو ترجمہ 23 صفحات پر مشتمل ہے اور چار صفحات وقف ہیں پیش لفظ کے لیے جسے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے تحریر کیا ہے۔ اپنے مختصر مگر جامع پیش لفظ میں پروفیسر قاسمی نے دارا شکوہ کی شخصیت، روحانیت اور رسالے کی اہمیت و معنویت و افادیت اور عادل اسیر دہلوی کی فن ترجمہ پر مہارت کو بڑی خوبی، خوب صورتی اور اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ سمندر کو کوزے میں سمو دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"محمد دارا شکوہ، ملقب بہ شاہ بلند اقبال، شاہجہاں کا بڑا لڑکا تھا۔ ہندستان کے شاہی مغل خانوادوں میں سب سے زیادہ فاضل اور کثیر التصانیف شاہزادہ گزرا ہے۔ میرک شیخ (متوفی ۱۰۴۰ھ) شیخ احمد دہلوی، مرزا ابوالقاسم خضر بیگی (متوفی ۱۰۵۰ھ) خود دارا شکوہ کے بقول اس کے معلم رہے تھے۔ اس نے عربی و ادبی علوم سیکھے، ہندو ادب، فلسفے اور سنسکرت سے واقفیت حاصل کی۔ خطاطی اور نقاشی سیکھی۔ معروف ایرانی خطاط میر عماد کی بہن کے لڑکے عبدالرشید دیلمی سے خوش نویسی سیکھی۔ لاہور میں قادری سلسلۂ تصوف کے معروف بزرگ میاں میرؒ (متوفی ۱۰۴۵ھ) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوا۔ ان کی سوانح لکھی۔ ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں کے احوال بھی لکھے۔ میاں میرؒ کے انتقال کے بعد کشمیر میں میاں میرؒ کے خلیفہ ملا شاہ بدخشی سے وابستہ ہوا اور عرفان و تصوف کے مراحل سے آگاہی حاصل کی۔

دارا علمی مزاج سے متصف تھا۔ عرفان و الہیات نے اس کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کررکھا تھا۔ اس نے اپنا زیادہ وقت ان ہی میدانوں کی سیاحت میں لگا دیا۔

دارا شکوہ کا اہم علمی کارنامہ ہندستانی مذہب و تہذیب سے متعلق سنسکرت کی بعض بنیادی کتابوں کے فارسی ترجمے کرنا یا کرانا ہے۔ اس نے پچاس اپنشدوں کا 'سِرِ اکبر' کے نام سے خود فارسی میں ترجمہ کیا۔ 'جوگ وششٹ' کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ دارا شکوہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندستان میں مسلمان، ہندو مذہب و تہذیب سے روشناس ہوں اور اس طرح وہ غلط فہمیاں جو کہ ان دونوں مذہب کے ماننے والوں کے درمیان پھیل گئی ہیں، دور ہوں۔ باہمی مصالحت کی فضا پیدا ہو۔ اسی مقصد سے اس نے ایک شاہکار کتاب 'مجمع البحرین' لکھی اور اسلامی و غیر اسلامی عرفان میں ایک دوسرے سے مشابہ افکار و اعمال کی نشان دہی کی۔

دارا شکوہ کے تعلق سے یہ بنیادی معلومات بے حد اہم ہیں۔ 'رسالۂ حق نما' کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر قاسمی نے لکھا ہے کہ 'رسالۂ حق نما' جیسا کہ خود دارا شکوہ نے اس رسالے میں اشارہ کیا ہے، 'سفینۃ الاولیا' اور 'سکینۃ الاولیا' کے بعد مکمل ہوا۔ یہ رسالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے دارا شکوہ کی اور کتابوں سے مختلف ہے۔ اس میں دارا شکوہ تصوف و الہیات کے دقیق مسائل سے بحث کررہے ہیں اور ان اذکار و اشغال کی توضیح کررہے ہیں جو کہ ان پر عمل پیرا ہونے والوں کو حق تک پہنچا دیتے ہیں۔ ترجمے کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

"ترجمہ کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان جس قدر ممکن ہوسکتا تھا آسان استعمال کی ہے۔ انھوں نے رسالہ کے مطالب کو اچھی طرح سمجھا بھی ہے اور اردو ترجمے سے اس زبان کے قارئین کو سمجھایا بھی ہے۔"

'رسالۂ حق نما' ایک تمہید اور چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔ تمہید میں خود اور خدا کو پہچاننے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس تک رسائی کے دو طریقے ہیں، ایک تو اس کے فضل و کرم کا ہے اور دوسرا مجاہدہ اور ریاضت کا۔ اس کے بعد مختلف فصلوں کے ذریعے اس کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ فصل اول میں عالم ناسوت کا بیان ہے۔ دوسری میں عالم ملکوت کا، تیسری فصل میں 'عالم جبروت' کا، چوتھی فصل میں 'عالم لاہوت' کا اور پانچویں فصل میں 'ہویت' کی وضاحت ہے اور چھٹی فصل میں 'وحدت' کی وضاحت کی گئی ہے۔

مختلف عالموں کی شناخت اس طرح کرائی گئی ہے:

عالم ناسوت ہی عالم محسوسات سے عبارت ہے۔ بعض لوگ اس کو عالم شہادت، عالم ملک و عالم چہار و عالم بیداری بھی کہتے ہیں۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اس عالم ناسوت میں طلب حق کی خواہش ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے اور کیسے کرنا چاہیے۔

عالم ملکوت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس عالم کو عالم ارواح، عالم غیب و عالم

لطیف و عالم خواب بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد ناسوت اور ملکوت کے فرق و امتیاز کو واضح کیا گیا ہے۔

عالم جبروت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس عالم کو عالم لاہوت، عالم احدیت و تعین اور عالم بے نقش بھی کہتے ہیں۔

عالم لاہوت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس عالم کو عالم ہویت و عالم ذات و عالم بے رنگ و عالم اطلاق و عالم بحت بھی کہتے ہیں اور یہ عالم ناسوت و ملکوت و جبروت کی اصل ہے اور سب پر محیط ہے۔ دوسرے عالم جسم کی مانند ہیں اور یہ عالم ان کی جان ہے۔ تمام عالم اسی میں آتے ہیں اور اسی سے نکلتے ہیں۔ یہ ہمیشہ اپنے آپ میں یکساں رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کی مزید تشریح کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ہر ایک کے لیے تحریر بھی نہیں کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اسی کے لیے مفید ہے جو راہ سلوک کا مسافر ہے اور جس نے خود کو اس دریا میں اُتار دیا ہے۔ اب اگر اسے اس دریا کو عبور کر کے منزل تک پہنچنا ہے تو اس میں بیان کی گئی تفصیلات پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔

دارا شکوہ کا بیان ہے کہ وہ خود اس پر عمل پیرا ہوا ہے تب جا کر یہ موتی اس نے چنے ہیں۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ ایک ہزار پچپن ہجری میں مکمل ہوا ہے اور اس رسالے کی تصنیف محض اللہ کا کرم ہے۔

عادل اسیر دہلوی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک اہم نسخے کو آسان زبان میں ضرورت مندوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس رسالے کی اپنی ایک اہمیت بھی ہے اور افادیت بھی۔ توقع ہے کہ اس سے لوگ مستفید ہوں گے۔

●●●

بقیہ: مصحفی اور اُن کا عہد: ایک جائزہ

صفحہ ۲ سے آگے

ان کی مثنوی 'سحرالبیان' کی وجہ سے ہے۔ مثنویوں کے علاوہ انھوں نے غزل کا بھی اچھا خاصا سرمایہ یادگار چھوڑا۔ مصحفی کی طرح میر حسن کے دیوان غزلیات میں بھی مختلف اساتذہ کی پیروی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے سودا و میر کے رنگ کو اخذ کرنے کی کوشش کی۔ مایوسی و ناکامی کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی کے مضامین بھی ان کے کلام میں نظر آتے ہیں اور تصوف و معرفت کے خیالات بھی نظم ہوئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کی غزل میں تنوع اور رنگارنگی ہے۔ نظیر اکبرآبادی اس عہد کے اکلوتے شاعر ہیں جنھوں نے نظم نگاری میں گراں قدر سرمایہ یادگار چھوڑا۔ نظیر نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن کو باندھنا اس عہد میں شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ سزا کے طور پر نظیر کو عرصہ دراز تک تذکرہ نگاروں کی فہرست سے باہر رہنا پڑا۔ بالآخر جب ان کا تمام کلام شائع ہوا تو ان پر خصوصی توجہ کی گئی۔ نظیر کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں اس عہد کی تہذیب و ثقافت کو سمیٹ لیا اور آئندہ نظم نگاری کے امکانات کو روشن کر دیا۔

مصحفی نے اپنی ادبی عمر کا بیشتر حصہ دہلی اور لکھنؤ میں بسر کیا۔ مصحفی کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ کی شعری روایت کا پورا احترام پایا جاتا ہے۔ مصحفی اگر چہ دہلویت ہی کو مستند قرار دیتے رہے لیکن ان کی شاعری لکھنوی فضا سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ دہلوی شعرا نے ایہام گوئی کو فروغ دیا۔ شاعری میں تصوف و معرفت کے خیالات کو بہت اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ دہلوی شعرا کو چوں کہ لکھنؤ کی طرح شاہی درباروں میں پاؤں جمانے کا موقع نہ ملا اس لیے خانقاہیں ہی اس عہد میں گوشۂ عافیت بنی ہوئی تھیں۔ چناں چہ عوام کے ساتھ شعرا بھی ان کی جانب مائل ہوئے۔

لکھنؤ میں حالات دہلی کے برعکس تھے۔ مال و دولت کی فراوانی، فارغ البالی اور عیش و نشاط کے ماحول نے قدرتی طور پر شعرا کو متاثر کیا۔ درباروں میں شعرا کا گرم جوشی سے استقبال کیا جانے لگا۔ شعرا بھی امرا و سلاطین کو خوش کرنے میں دل چسپی لینے لگے۔ چناں چہ شعرا کے درمیان چشمکوں اور معرکہ آرائیوں کا ہونا فطری تھا۔ ان معرکہ آرائیوں میں بعض اوقات خود حکمراں طبقہ بھی دل چسپی لیتا تھا۔

یوں تو حکمت، اخلاق، قلبی واردات کا بیان، تصوف اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی شاعری میں کی جاتی رہی ہے لیکن اس عہد کی شاعری اور بالخصوص غزل کا اصل موضوع حسن و عشق ہی رہا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اسکولوں میں عشق کی نوعیت جدا جدا نظر آتی ہے۔ مصحفی کی غزل میں دردمندی اور سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے اور شوخی و سرمستی اور معاملہ بندی بھی پائی جاتی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر بعض مضامین کی فراوانی بھی نظر آتی ہے لیکن مصحفی دیگر لکھنوی شعرا کی طرح بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئے اور اپنے کلام کو مبتذل نہیں ہونے دیا۔ مصحفی کی عشقیہ شاعری میں وسعت اور ہمہ گیری ہے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: دانش وروں کا رول

صفحہ ۸ سے آگے

(مغرب زدہ عرب تصورات اسلامی تصورات) وہاں آپ کو ایذا پہنچانے، کوڑے لگانے اور بنا مقدمہ چلائے موت کی سزا دینے کا استحقاق ہے۔

یہ بالکل پاگل پن ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ ہر انسان کا ایک وقار ہے اس لیے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے، اس لیے ہمیں انصاف اور مساوات کی عالمگیر اقدار میں یقین رکھنا چاہیے اور دوسری بات یہ کہ ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کرنا چاہیے اس کے باوجود کہ سچ بولنے میں پریشانی اور شرمندگی کا سامنا ہے۔ آپ کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ سچ بولنے میں نقصان ہے اور تیسری اور انتہائی اہم بات جس سے مجھے رہنمائی حاصل ہوئی وہ یہ کہ آپ یہ سچ تنہا اپنے شیش محل میں بیٹھ کر نہیں بولیں گے۔ یہ سچ آپ کو زمین پر پاؤں رکھ کر بولنا ہے۔ زمین پر رہنے والے ان لوگوں کے لیے بولنا ہے جن کے منہ پر تالے ڈال دیے گئے ہیں جو کچلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پورا فلسطین میرے لیے ایک انتہائی اہم علامت کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے نہیں کہ میں ایک فلسطینی تھا۔ ٹھیک ہے میں ایک فلسطینی تھا لیکن ہماری جدوجہد ہماری مصیبتوں کے بیچ کچل دیا گیا، اس کی آواز دبا دی گئی یہاں تک کہ مغرب میں لفظ 'فلسطین' کا منہ سے نکالنا بھی انتہائی مشکل ہو گیا۔

چنانچہ دانشور کا کام ان یادوں کی بازیافت ہے۔ میرا کہنا ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے لوگوں نے کتنا ظلم برداشت کیا ہے، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم کن کن مصائب سے گزرے ہیں، ہمیں اپنے رہنماؤں کی غلطیوں کو نہیں بھولنا ہے، ہمیں اپنے لیڈروں کی غلطیوں کے اظہار کے معاملے میں ایمان دار ہونے کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے اگر ہم کوئی ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے لیے زیادہ شرمندگی کا باعث ہو تو پھر وہ ہمیں روزگار نہیں دیں گے۔ ہم کوئی اہم افسر نہیں بن پائیں گے یا ہمیں کوئی اعزازی ڈگری نہیں مل سکے گی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا ذکر کریں جنھیں اقتدار نے کچل کر رکھ دیا ہے۔ یہ پروا کیے بغیر کہ ہمیں اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اور یہ بجائے خود ہمارے لیے نہ صرف فخر کا باعث ہوگا بلکہ انسانی بھائی چارے کا بھی۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح ہم لوگوں کے ساتھ ایک غیر جابرانہ اور غیر تحکمانہ انداز میں رشتہ استوار کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ان کی جدوجہد میں ان کے ساتھ ہیں اور آپ کے پاس اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کو بھی نہیں رہ گیا کہ وہ کیا ہیں اور کیا چاہتے ہیں اور آپ کے بولنے کی صلاحیت کو صحیح سمت دینے والے اور اس پر اثر انداز ہونے والے وہی لوگ ہیں جو جدوجہد میں مبتلا ہیں۔ جدوجہد کس چیز کی۔ ہم خود مختاری، انسانی وقار کے امیدوار اسی کے لیے تو جدوجہد کرتے ہیں۔ ایک خوش آئند مستقبل کی امید یہ کوئی یوٹوپیائی (Utopian) خیال نہیں، صرف ایک عام سی امید ہے، یہ امید کہ جو خراب صورت حال ہے اسے بہتر میں بدل دیں اور مجھے لگتا ہے اس کے بغیر دانش ور ہونے کا کوئی مطلب نہیں۔

■◆■

تیسری اور آخری قسط

دانش وروں کا رول

ایڈورڈ سعید

انگریزی سے ترجمہ: صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز

تحفظ صحت (Healthcare) کے سلسلے میں ایک متبادل یہ سمجھ میں آیا کہ کینیڈا کی طرز پر حکومت ملک کے ہر فرد کا صحت بیمہ کرے جیسا کہ دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی ہوتا ہے۔ فرانس اور یورپ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ حکومت شہریوں کی ذمے داری لیتی ہے۔ ہاں امریکہ میں یہ نہیں ہوتا۔ اس موقعے پر میڈیا کو استعمال کیا گیا اور میڈیا کو اس طرح استعمال کیا گیا کہ وہ اس مباحثے کا پروپیگنڈہ کرے۔ کیا یہ مباحثہ ایسے دو فریقوں کے درمیان تھا جن میں سے ایک کینیڈا کی طرز Healthcare سسٹم کے حق میں تھا اور دوسرا اس پرائیویٹ علاج کے سسٹم کے حق میں تھا جس کا کہ فی الحال رواج ہے، ایسی بات ہرگز نہیں تھی۔

یہ مباحثہ تو دراصل صرف پرائیویٹ اور ادویات کے شعبے سے متعلق تھا جہاں فارما کیوٹیکل کمپنیوں کی میڈیکل ایسوسی ایشن کے مختلف گروپ اس اسکیم کے تحت بھاری رقمیں کمانا چاہتے تھے اور انھوں نے ریڈیو پر، ٹی وی میں اور اخبارات میں اس کا پروپیگنڈہ کیا تھا اور انھوں نے ملک کے ہر شہری کے ذہن کو اس مباحثے میں سوشیلائزڈ (Socialized) طریقہ علاج کا نام دیا تھا۔ اور لفظ Socialized پر خاص زور تھا جیسے یہ کوئی بری چیز کوئی کمیونسٹ یا روسی مارکسسٹ لیننسٹ قسم کی کوئی چیز ہو۔ یہ کتنی غلط بات ہے اور اس بارے میں میڈیا نے خود اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔

تو گویا میڈیا بھی اقتدار اور طاقت کے ہاتھوں کرپٹ ہو گیا۔ اب میں ایک آخری مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک عظیم صحافی آئی۔ ایف۔ اسٹون، جن کا آج سے بیس برس پہلے انتقال ہو گیا، ان کا خیال تھا کہ ہر گورنمنٹ رپورٹ جھوٹی ہوتی ہے اس لیے کہ شاید گورنمنٹ نہ تو پورا سچ بتاتی ہے اور نہ وہ بتا سکتی ہے چوں کہ بہت ساری چیزیں اور اعداد و شمار وغیرہ ایسے ہوتے ہیں جن کی پردہ پوشی کرنی پڑتی ہے۔ چناں چہ انھوں نے خود اپنا ایک اخبار نکالا۔ ان کا کہنا تھا کہ اخباروں کا وقار بڑا اونچا ہو جاتا ہے اس لیے کہ واشنگٹن میں ایک صحافی سکریٹری آف اسٹیٹ کے ساتھ لنچ کھاتا ہے، ایسی حالت میں بھلا وہ سچ کیسے لکھ سکتا ہے، اس لیے کہ اگر وہ سچ لکھ دے تو سکریٹری آف اسٹیٹ پھر اس کے ساتھ لنچ نہیں کھائے گا اور پھر اس صحافی کو ٹی وی پر بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ چناں چہ اسٹون نے خود اپنے ہی گھر سے اپنا ایک اخبار شروع کیا۔ یہ صرف چار صفحات کا اخبار تھا جس میں گورنمنٹ جو کچھ کہتی تھی اس کے بارے میں وہ اپنے شبہات اور اپنی نجی تحقیق چھاپتے تھے اور کوریا کی جنگ اور بعد میں ویت نام کی جنگ کے دوران اس اخبار کا بھی رول تھا۔ اسٹون انفرادی طور پر تنہا اقتدار اور طاقت کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ کسی وزیر کے ساتھ یا اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے کسی ملازم کے ساتھ لنچ کھانے سے انکار کیا اس لیے کہ وہ اپنی خودمختاری کا تحفظ کرنا چاہتے تھے اور میں اس بات پر پورا یقین کرتا ہوں اس لیے کہ میں خود سیاست میں رہا ہوں اور مجھے بھی اکثر یہ دعوت دی جاتی رہی ہے کہ ہمارے ساتھ آؤ مل کر بیٹھو، یہ کرو، وہ کرو وغیرہ۔ اور میں نے بھی ہمیشہ اس طرح کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اس لیے اس سے آپ اپنی خودمختاری کھو بیٹھتے ہیں۔ آپ اس بات کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں کہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط اور پھر آپ سمجھوتے کرنے کی پوزیشن میں آجاتے ہیں۔

اور چوتھی رکاوٹ وہ ہے جسے میں بت پرستی سے تعبیر کرتا ہوں۔ ہم ایک بے تحفظی کے دور میں جی رہے ہیں۔ ہم اگلے الفیہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سرد جنگ ختم ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی یہ نہیں جانتا کون سی اقدار پائیدار ہیں اور کون سی نہیں، اس لیے میرے نزدیک یہ منکوسیت (Conversion) کا دور ہے۔ میرا خیال ہے کہ دانش ور کو ہمیشہ ایک سیکولر آدمی ہونا چاہیے جو کوئی بت نہیں مانتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مذہب ایک بالکل نجی معاملہ ہے۔ اگر آپ ذاتی طور پر خدا میں کسی ایک خدا یا ایک سے زیادہ خداؤں میں یقین رکھتے ہیں جو آپ کے لیے مقدس اور مافوق البشر ہے تو یہ آپ کا مسئلہ اور آپ کا حق ہے لیکن میں یہاں سماجی خداؤں کی بات کر رہا ہوں جن کے بارے میں فرانسس بیکن نے کہا ہے کہ یہ منڈی کے خدا ہیں۔

مثال کے طور پر سرد جنگ کے زمانے میں، یہ مجھے لوگ مارکسزم کا احترام کرتے ہیں۔ پھر انھوں نے بار بار کہا کہ مارکسزم زیادہ اچھا نہیں تھا۔ چناں چہ سرد جنگ کے بعد انھوں نے اپنا مسلک بدل لیا اور سرمایہ داری کی طرف رجوع ہو گئے اور انھوں نے اس کی پرستش شروع کر دی، یہ بھی ایک طرح کی بت پرستی ہے۔ ایک فرانسیسی دانش ور تھے جو تمام عرب دنیا میں گھومتے رہے ہیں وہ فرانس میں کمیونسٹ پارٹی کے سابق لیڈر تھے اس کے بعد وہ بہت ہی معتقد قسم کے کیتھولک ہو گئے اور اب حال ہی میں وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ سعودی عرب سے نزدیک آنے کے بعد انھیں اس میں آسانی تھی۔ انھوں نے اپنا نام بھی بدل کر اسلامی رکھ لیا ہے اور اب وہ انھی کی طرح بات بھی کرتے ہیں۔ اس طرح کی بت پرستی سے میری ریڑھ کی ہڈی میں کرنٹ سا دوڑ جاتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ قابل مذمت کام ہے اس لیے کہ ایک دانش ور کو ہمیشہ اپنے آپ کو جھوٹے خدا کی پرستش سے بچانا چاہیے اس لیے کہ ایسے بتوں کو کبھی بھی آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔ دوسرا کوئی بت آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا "میں بتاتا ہوں میں تمھیں کیا دوں گا۔ برلن جانے کے لیے ایک فرسٹ کلاس کا ٹکٹ، تم برلن آؤ، ایک سال بنا کسی پریشانی کے وہاں رہو، وہاں لکھو پڑھو کچھ بھی کرو، لیکن آخر میں تمھیں ہم میں سے ایک ہونا ہوگا"۔

تو اس طرح کے انعامات اور بت ایسے خدا ہیں جن کی پرستش مہنگی پڑتی ہے اور بالآخر یہ خدا ناکام ثابت ہوتے ہیں، اس لیے میں کہتا ہوں کہ دانش ور کا صرف خودمختار ہونا ہی کافی نہیں، اسے جہاں تک ہو سکے ہمیشہ لاتعلق رہنا چاہیے۔ حرف آخر تمام کی کہیں کوئی چیز نہیں ہے، نئی دریافت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ دنیا ہمیشہ ہم پر اپنے کو منکشف کرتی رہتی ہے۔ انسان کو تاریخ میں یقین رکھنا چاہیے۔ تو پھر یہ کیا بات ہوئی کہ بالآخر دانش ور تمام رکاوٹوں کو ختم کرتا ہوا روایت، پروفیشنلزم، طاقت، اقتدار، اصنام اور خداؤں کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ آخر یہاں ہندستان میں، عرب ملکوں میں، یورپ میں، افریقہ میں، لاطینی امریکہ میں دانش ور کو کس چیز کی جستجو ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر جگہ ایک ہی ایسے آدرش ہیں جیسا کہ ایک ہی طرح کے خطرات ہیں۔

آپ چاہیں تو اقتدار کے غلام ہو سکتے ہیں یعنی درباری دانش ور۔ آپ طاقت کے خدمت گار ہو جایئے یا پھر آپ باہر ہیں۔ اور میں تو باہر رہنے کو زیادہ ترجیح دیتا ہوں۔ ایک ایسا شخص جس نے اقتدار سے مستقل قسم کی جلاوطنی اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن یہ سب کس لیے، میری رائے ہے کہ ہمیں عالمگیر (Universal) اقدار کی ضرورت ہے۔ انصاف کی عالمگیر اقدار جہاں مرد اور عورت خواہ سیاہ، سانولے، سرخ یا زرد رنگ کے ہوں، کسی خطے سے تعلق رکھتے ہوں ان سب کو ایک طرح کی آزادی اور برابری کا حق ملنا چاہیے۔ لیکن یہ بات آپ اس طرح نہیں کہتے۔ بقول جان اسٹورٹ مل ہاں میں عمومی طور پر ان باتوں میں یقین رکھتا ہوں لیکن جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے وہ جمہوریت کے لیے تیار نہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ انسانی حقوق میں یقین رکھتے ہیں تو پھر انسانی حقوق کا اطلاق سب جگہ ایک ہی طرح ہونا چاہیے۔ آپ ایسا نہیں کہہ سکتے جیسا ہم دنیا کے اس حصے میں کہتے ہیں، جس سے ہمارا تعلق ہے۔ "ہاں ٹھیک ہے لیکن یہ مغربی تصورات ہیں، جہاں تک عرب تصورات کا تعلق ہے،

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org